سورۃ فاتحہ

اور

تصورِ عبادت

پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری

منہاج القرآن پبلی کیشنز لاہور
مرکزی سیکرٹریٹ ۳۶۵/ایم ماڈل ٹاؤن

نام کتاب	سورہ فاتحہ اور تصور عبادت
تصنیف	پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری
ترتیب و تدوین	ضیاء اللہ نیر
کمپوزنگ	محمد سلیم حسن
زیر اہتمام	ظفر اقبال
نگران طباعت	محمد عامر نواز
اشاعت اول	فروری ۱۹۹۷ء
تعداد	تین ہزار
قیمت	16
مطبع	منہاج القرآن پرنٹرز

نوٹ: پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری صاحب کی تمام تصانیف اور خطبات و تقاریر کے ریکارڈ شدہ کیسٹوں سے حاصل ہونے والی جملہ آمدنی ان کی طرف سے ہمیشہ کے لئے ادارہ منہاج القرآن کے لئے وقف ہے۔

ناظم نشرو اشاعت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مَوْلَاے صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا أَبَدًا

عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّهِمِ

مُحَمَّدٌ سَیِّدُ الْکَوْنَیْنِ وَالثَّقَلَیْنِ

وَالْفَرِیْقَیْنِ مِنْ عُرْبٍ وَّمِنْ عَجَمِ

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم

گورنمنٹ آف پنجاب کے نوٹیفیکشن نمبر ایس او (پی-۱) ۸۰/۱-۴ پی آئی وی مورخہ ۳۱ جولائی ۸۴، گورنمنٹ آف بلوچستان کی چٹھی نمبر ۸۷-۴-۲۰ ای جنرل وایم ۴/۷۰/۹۷-۳-۷۷ مورخہ ۲۶ دسمبر ۱۹۸۷ء، شمال مغربی سرحدی صوبہ کی حکومت کی چٹھی نمبر ۱۱۴۴ ۲۴-۷-۶۷ این-۱/۱ اے ڈی (لائبریری) مورخہ ۳۰ اگست ۸۶ء اور آزاد حکومت ریاست جموں وکشمیر مظفر آباد کی چٹھی نمبر س ت / انتظامیہ / ۶۳-۸۰۶۱ / ۹۲ مورخہ ۲ جون ۹۲ء کے تحت پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تصنیف کردہ کتب ان صوبوں میں تمام کالجوں اور سکولوں کی لائبریوں کے لئے منظور شدہ ہیں۔

فہرست

سورہ فاتحہ اور تصور عبادت

اس سے قبل ہم سورہ فاتحہ کے حوالے سے اعتقادی تصورات کے ذیل میں اس کی پہلی تین آیات پر قدرے شرح و بسط سے روشنی ڈال چکے ہیں۔ اس سلسلے کا پہلا مضمون بعنوان "سورہ فاتحہ اور انسانی زندگی کے اعتقادی پہلو" توحید، رسالت اور آخرت کے ایمانی عقائد کے بارے میں تھا۔ اب ہم سورہ فاتحہ کی چوتھی آیت "**ایاک نعبد و ایاک نستعین** سے متعلق جس مضمون پر اظہار خیال کریں گے اس کا موضوع ہے "سورہ فاتحہ حیات انسانی کا عملی پہلو جیسا کہ ہم پہلے اس امر کی وضاحت کر چکے ہیں کہ سورہ فاتحہ کے مضامین کو مکمل کرنے کے بعد اس کی آیت وار لفظی تفسیر ہم نے آئندہ کے لئے موخر رکھی ہے سردست زیر نظر مضمون میں اس مقام کی مناسبت سے ہمیں اس امر کا جائزہ لینا ہے کہ اللہ رب العزت نے اس آیت کریمہ کے ذریعے انسانی زندگی کے کن عملی گوشوں اور پہلوؤں کی اصلاح کا سامان فراہم کیا ہے۔ اعتقادی تصورات توحید، رسالت و آخرت کی اصلاح کے بعد جو اسلامی معتقدات کی بنیاد ہیں ان کی اصلاح کے بعد یہ ضروری تھا کہ اصلاح عمل کی طرف توجہ مبذول کی جائے۔

انسانی زندگی کی حقیقت عقیدہ و عمل سے بنتی ہے

مبادیات دین میں سے اس امر کا جاننا ضروری ہے کہ انسانی زندگی کی حقیقت دو چیزوں سے مل کر تشکیل پاتی ہے جو عقیدہ اور عمل ہیں عقیدے کی اصلاح کا کام سورہ فاتحہ کی پہلی تین آیتوں سے سرانجام پایا۔ اس کے بعد انسانی زندگی کے عملی پہلو کے اصلاح طلب ہونے کا مضمون وارد ہوا تو سورۃ فاتحہ میں حکم ہوا کہ اے لوگو! اس آیت کریمہ کے ذریعے اللہ رب العزت کی بارگاہ میں سراپا نیاز بن کر التجا کرو **ایاک نعبد و ایاک نستعین** (اے پروردگار ہم فقط تیری عبادت کرتے ہیں اور فقط تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں) اس آیت کے ذریعے اللہ رب العزت کے معبود و مستعان ہونے کا ذکر مذکور ہے اس سے پہلے یہ بیان کیا گیا کہ اللہ رب بھی ہے، رحمان بھی ہے، رحیم بھی ہے

اور مالک بھی تو یہ لازم ہوا کہ عبادت کا حقدار بھی وہی ہی ہو۔ ویسے بھی منطقی انداز سے لیا جائے تو ایک ہستی جو پیدا بھی کرتی ہے پالتی بھی ہے اور اسی کی رحمت ہر ایک کی ہمہ وقت شریک حال بھی ہے اور جزاوسزا کا سارا نظام اسی کے ہاتھ میں ہے تو کیا اس کے علاوہ کوئی اور ذات عبادت کی حقدار و سزاوار ہو سکتی ہے جب یہ تصور ذہن میں صحیح طرح راسخ ہوگیا تو اسی تصور کو واضح کرنے کے لئے حکم دیا گیا کہو۔ **ایاک نعبد و ایاک نستعین** گویا اس کے ذریعے تخصیص پیدا کر دی اور مفعول کو مقدم کرکے بات سمجھا دی کہ اے لوگو تمہاری جملہ ضرورتوں' ضرورت وجود' ضرورت بقا اور ضرورت کمال کا کفیل فقط اللہ ہے تو اس بات میں کیا کسی کو کوئی کلام ہو سکتا ہے کہ تمہاری عبادت کا حقدار بھی وفقط وہی ہے اور جب عبادت فقط اسی ذات بے ہمتا کو زیبا ہے تو مدد اور اعانت طلب کرنے کے لئے فقط اسی کے آگے دست سوال دراز کیا جائے۔

دو عملی تصوارت

آیت کریمہ میں دو الفاظ استعمال ہوئے جن کے ذریعے انسانی زندگی کو دو عملی تصورات عطا کردیئے گئے استعمال کردہ الفاظ میں ایک **نعبد** اور دوسرا **نستعین** پہلا تصور بادی النظر میں عبادت کا اور دوسرا استعانت کا عبادت بندگی کو کہتے ہیں اور استعانت مدد طلب کرنے کو ہم نے ان دونوں تصورات کی روشنی میں اس پہلو پر محنت کرنی ہے کہ دونوں تصورات پوری انسانی زندگی کو محیط ہیں اور ان سے انسانی زندگی کے سارے گوشوں کی اصلاح مطلوب ہے گویا ان تصورات کو رگ و ریشے میں اتار لینے اور متحقق کرنے سے زندگی کے جتنے بھی عملی پہلو ہیں وہ عبادت اور استعانت کے درست ہونے سے خود بخود درست ہو جاتے ہیں اور ظاہری و باطنی رندگی عملاً سنور جاتی اور اس میں کوئی جھول لغزش' خطاء' کجی اور گمراہی باقی نہیں رہ جاتی۔ یہ بات ہمیشہ کے لئے ذہن نشین کرلی جائے کہ ان دو تصورات کی صحیح تفہیم اور تعمیل سے پوری زندگی روبہ اصلاح ہو جاتی ہے۔

عبادت اور استعانت سے کیا مراد ہے؟

اب ہم یہاں دیکھیں گے کہ عبادت اور استعانت سے بالعموم کیا مراد لیا جاتا ہے۔ عبادت عرف عام میں کمال عاجزی انتہائی انکساری، تذلل اور خشوع و خضوع کو کہتے ہیں۔ جب یہ سب اپنے انتہائی درجے کو پہنچ جائیں اور اس سے آگے عاجزی اور تذلل کا تصور بھی نہ کیا جاسکے تو پھر اسے عبادت کا نام دیا جاتا ہے یاد رہے کہ عاجزی اور تذلل کے مقابلے میں عظمت اور کبریائی ہے عاجزی کا مقابلہ بڑائی اور انکساری و تذلل کا مقابلہ کبریائی سے کیا جاتا ہے تو جب بندہ عبادت میں پیکر عجز و نیاز بن جاتا ہے تو وہ اپنے اس فعل سے یہ ظاہر کرتا ہے کہ اے اللہ میں تیرے مقابلے میں اتنا کمتر، عاجز، منکسر، ذلیل اور گرا ہوا ہوں کہ اس سے زیادہ گراوٹ اور تذلل کی کیفیت اور ممکن ہی نہیں۔ اس نہایت درجہ انکساری و عاجزی کے اظہار سے وہ گویا اس امر کا اعتراف کرتا ہے کہ باری تعالیٰ جتنی بھی بڑائی عظمت اور کبریائی ممکن ہو سکتی ہے اور جس نقطہ کمال تک جاسکتی ہے وہ ساری کی ساری تیرے لئے ہے اور تو ہی بدرجہ اتم عظمت و کبریائی کا حقدار و سزاوار ہے۔ یہ ساری باتیں وہ لفظ **"ایاک نعبد"** کہنے سے ہمارے حیطہ خیال میں آجاتی ہیں۔

عبادت کے بارے میں ایک اشکال

عملی زندگی کی اصلاح کے باب میں یہاں عبادت کے بارے میں ذہنوں میں پائے جانے والے ایک اشکال کو سمجھنے اور اسے دور کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے اندر عبادت کا ایک محدود تصور راسخ ہو گیا ہے جس کے تحت ہم خاص مذہبی رسموں Rituals اور روایات پر مبنی اعمال کو عبادت کا نام دیتے ہیں۔ اس تصور کے تحت ہمارے نزدیک عبادت سے مراد فقط نماز، روزہ، زکوۃ، حج، تسبیح و تہلیل اور استغفار کرنا رہ گیا ہے حالانکہ یہ محض قولی، فعلی اور بدنی قسم کے اعمال ہیں ضروری ہے کہ عبادت کے اس محدود تصور کے تنگ حصار سے باہر نکلا جائے۔

سورۃ فاتحہ میں نعبد کے ذریعے جو تصور عطا کیا گیا ہے وہ اپنے اندر وسعت گہرائی اور گیرائی رکھتا ہے۔ یہ امر ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ عبادت' عبدیت اور عبودیت ہم معنی الفاظ ہیں جن کا معنی بندگی ہے جو اس امر کے اعلان کا بندہ سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ اس بات کا اقرار کرے کہ مولا میں فقط تیرا بندہ ہوں اور میری بندگی فقط تیرے لئے ہے۔ تو اس اعتبار سے عبادت حقیقی اور معنوی اعتبار سے اس وقت تک عملاً انسان کی زندگی میں داخل نہیں ہوتی جب تک وہ اس تصور کو مخصوص حالات وواقعات' افعال واعمال اور لمحات کے تنگ دائرے سے باہر نکال کر اسے اول تا آخر پوری زندگی پر حاوی نہیں کر لیتا۔

یہ بات ذہن میں مستحضر کرائی جائے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا ہی اپنی بندگی کے لئے فرمایا ہے جیسا کہ ارشاد ہوا۔

و ماخلقت الجن والانس الا لیعبدون	ہم نے جنوں اور انسانوں کو پیدا ہی اس لئے کیا ہے کہ وہ ہماری عبادت بجا لائیں۔

اگر عبادت سے مراد نماز' روزہ' زکوۃ' حج جیسے مخصوص اعمال ہوں اور فقط وہ عمل جو مسجد میں داخل ہو کر کئے جانے سے متعلق ہو تو پھر باقی زندگی جو مسجد سے باہر گزرتی ہے اور جس کا تعلق کھانے پینے' چلنے پھرنے' شادی بیاہ' سیاسی و اقتصادی جدوجہد روزگار کمانے' دفتری' تجارتی' سفارتی زندگی اور امارت' سیادت و قیادت سے ہے وہ ساری کی ساری زندگی بہمہ وجوہ عبادت سے خارج قرار پاتی ہے۔ اس طرح محولہ بالا حکم خداوندی انسانی زندگی سے متعارض ہو گیا اور معاذ اللہ زندگی خانوں (Compartments) میں تقسیم ہو کر رہ گئی۔ چوبیس گھنٹوں میں روزانہ پانچ وقت اور سال کے بارہ مہینوں میں ایک ماہ عبادت کے لئے مخصوص کر لینے اور باقی اوقات کو عبادت سے مستثنیٰ اور جدا قرار دینے سے وہ مقصد کہاں رہ گیا جس کی رو سے عبادت ان مخصوص ہیئتوں اور اوقات میں فرضیت کی ادائیگی سے کہیں؟ بالاتر ہے اگر عبادت

کے اس محدود اور از خود غلط تصور کو اپنا لیا جائے تو ان عبادات کو یکجا کرنے اور ایک تناسب قائم کرنے میں کتنا وقت صرف ہوتا ہے اور باقی مشاغل کو کس حساب وشمار میں رکھا جائے ایک نماز کو ہی لیں دن میں پنج وقتہ نمازوں میں زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ یا دو گھنٹے صرف ہوتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ چوبیس گھنٹوں میں بارھواں یا سولہواں حصہ عبادت کے لئے مخصوص ٹھہرا اور بقایا سارا وقت اس مقصد سے الگ کر دیا گیا۔

بنظر غائر سوچیں اور غور خوض سے کام لیں تو کیا انسانی ذہن اس بات کو تسلیم کرتا ہے اور کیا ایسا کرنا زندگی کی مقصدیت سے انصاف ہوگا اور یہ عدل کے تقاضوں کے مطابق ہوگا اس سوال کا جواب یقیناً نفی میں ہوگا اور ہمارا ذہن لامحالہ اس ارشاد ربانی کی طرف منعطف ہو جائے گا جس کی رو سے انسانی تخلیق اور انسانی زندگی کا مقصد ہی عبادت کو قرار دیا گیا ہے۔ عبادت کا یہ تصور وسیع تر ہونے کی بناء پر اس امر کا متقاضی ہے کہ اس بات کو تسلیم کیا جائے کہ عبادت ضرور ایسی چیز ہے جس سے زندگی کا کوئی ایک لمحہ بھی خالی نہیں۔ چونکہ عبادت کو مقصد تخلیق گردانا گیا ہے اور ایسا لمحہ جو اس مقصد سے ہٹ کر ہو اور دوری میں بسر ہو جائے وہ لمحہ زندگی بندگی کا نہیں شرمندگی کا ہے اس لئے کہ

زندگی ہے بندگی شرمندگی

تو یہ بات اچھی طرح سمجھنے کی ہے کہ پیدائش سے موت تک ساری زندگی عبادت کے مقصد کے تابع ہے گویا کہ عبادت کے تصور کا دامن اتنا وسیع ہے جس میں ہنسنے مسکرانے، کھانے، پینے تک ہر چیز اس میں سما جائے اس دامن کو اتنا تنگ مت تصور کیجئے کہ زندگی کا کوئی لمحہ تنگ دامنی کی وجہ سے اس میں داخل ہی نہ ہو سکے بلکہ اس کے اندر تو اتنی وسعت ہے کہ زندگی کے تمام کے تمام معاملات اس کے تابع ہو جائیں۔

آیئے اب ہم اس آیت کریمہ کی روشنی میں یہ دیکھیں کہ حقیقت حال کیا ہے بنظر غائر دیکھنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ **ایاک نعبد** سے پہلے کی تین آیات تصور عبادت کی وسیع بنیاد فراہم کرتی ہیں۔ ان تین آیات ہر آیت کریمہ پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ اللہ

رب العزت نے ہی بندے کو پردہ عدم سے باہر لاکر خلعت وجود عطا کیا اور پھر اپنی ربوبیت سے کمال تک پہنچا دیا اور قدم قدم پر اسے اپنے چشمہ رحمت سے فیضیاب کیا اور مرنے کے بعد اخروی زندگی میں اس پر جزا اور سزا اور مواخذہ و جواب طلبی کے مرحلے ہوں گے انسانی زندگی کے ان تین ادوار کے بعد مالک یوم الدین فرمایا کہ یوم جزا کا مالک وہی ہے۔

یہ تینوں آیات بالترتیب انسان کی زندگی کے آغاز اس کے وسطانی دور اور اختتام و انجام کی بات کرتی ہیں اور ان میں ان تینوں صفتوں کا ذکر ہے جن کے فیض سے انسانی زندگی کو سرفراز کیا گیا ہے۔ یہ الوہی فیض کبھی ربوبیت کے عنوان سے ملتا ہے۔ کبھی رحمانیت اور رحیمیت کے عنوان سے اور کبھی مالکیت کے عنوان سے انسانی زندگی کے شریک حال ہوتا ہے۔

حق بندگی کیسے ادا ہو

روز اول سے لے کر تادم آخر انسانی زندگی کے سارے احوال و کیفیات' اعمال و تغیرات' ضروریات و حاجات کو وہی ایک ذات پورا کر کے تکمیلی مراحل تک پہنچا رہی ہے جس نے اس زندگی کے ایک لمحے کو بھی فیض سے خالی نہیں رکھا اس لئے ایاک نعبد اس امر کا متقاضی ہے کہ اول سے آخر تک زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہ آئے جو اس ذات وحدہ لاشریک کی بندگی سے خالی ہو پہلی تین آیتوں کے بعد **ایاک نعبد و ایاک نستعین** سے بندے کے اس شعور کو بیدار کرنا مقصود ہے کہ چونکہ اس کی زندگی ہر قدم پر اس کے فیض و کرم کی محتاج ہے اس لئے اس پر کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرنا چاہیے جو اس کی بندگی سے محروم ہو لہٰذا یہ بندگی کا عمل بلا انقطاع جاری و ساری ہے اور حق بات یہ ہے کہ بندہ چاہے جتنی سعی اور کوشش کرے وہ اس حق کو زندگی بھر ادا نہیں کر سکتا اس لئے کہ

زندگی دی دی ہوئی اسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

جب زندگی میں عبادت اور بندگی کا یہ تصور راسخ ہو جائے تو پھر اللہ کی عبادت اور عبودیت انسان پر ہمہ تن اور ہمہ دم حاوی ہو جاتی ہے اور پھر یہ فرق اور امتیاز ہی باقی نہیں رہتا کہ انسان کی زندگی کے کونسے لمحے عبادت کے ہیں اور کونسے عبادت کے نہیں۔ پھر ہر فرق این و آں مٹ جاتا ہے۔ ایاک نعبد کہنے کا تقاضا یہ ہے کہ جب ہم نے یہ کہہ دیا تو پھر ہمارا ہر عمل عبادت ہے ہمارا کھانا پینا' اٹھنا' بیٹھنا' چلنا پھرنا' سونا جاگنا' کاروبار کرنا' میدان جنگ میں قدم اٹھانا' غرضیکہ کوئی حالت جہت اور کیفیت ایسی نہیں جو عبادت سے خالی ہو۔ چونکہ ہم ہروقت اللہ کے بندے ہیں لہٰذا ہر وقت حالت بندگی میں ہیں بہر حال ہر لمحہ عبودیت میں بسر ہو رہا ہے۔

ایاک نعبد مضارع کا صیغہ ہے جو دوام و استمرار پر دلالت کرتا ہے اس کا معنی یہ ہے کہ باری تعالیٰ ہم تیری عبادت و بندگی اس طرح سے کرتے ہیں کہ حال و مستقبل کا کوئی لمحہ تیری بندگی سے خالی نہیں۔

تصور عبادت سے متعلق ایک قرآنی اصول

عبادت کا وہ تصور جس سے عمل کی اصلاح ممکن ہو اس کو واضح کرنے کے لئے اللہ رب العزت نے قرآن مجید میں ایک اصول متعین فرما دیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے

قل ان صلوتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین

اے محبوب فرما دیجئے کہ بے شک میری نماز میری قربانی' میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ جہانوں کے پروردگار کے لئے ہے۔

اس آیہ کریمہ میں اللہ تعالیٰ اپنے محبوب سے فرما رہا ہے کہ میرے ان بندوں کو سمجھا دو کہ تمہاری ساری زندگی عبادت کس طرح بنتی ہے آپ فرما دیجئے کہ یہ

عبادت صرف اسی صورت میں ہوگی جب میری نماز' قربانی میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ تعالیٰ کے لئے ہو اگر تم اپنی زندگی اس ڈھب سے گزارو گے اور اس تصور کو اپنی زندگی میں جاگزیں کر لوگے تو پھر بشمول عبادت تمہارا ہر عمل یہاں تک تمہارا جینا اور تمہارا مرنا تمہارے رب کے لئے ہوگا۔ سوچنے کی بات ہے کہ جب جینا اور مرنا اس کے لئے ہو گیا تو پھر باقی کیا رہ گیا پھر چاہے نماز پڑھو' قربانی دو' اور جو نسا عمل بھی کرو' وہ اول تا آخر اللہ کے لئے ہوگا اور اس کے عبادت ہونے میں کوئی کلام نہیں۔

اس آیت کریمہ کے ذریعے جو نکتہ سمجھایا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ عقل سلیم رکھنے والا کوئی شخص یہ گمان بھی نہیں کر سکتا کہ نماز اور قربانی کا عمل اللہ کے سوا کسی اور کے لئے بھی ہو سکتا ہے۔ یہ دو ایسی چیزیں ہیں جنہیں غیر اللہ کی طرف کسی حالت میں منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دو چیزوں کو جن کی نسبت غیر اللہ سے نہیں ہو سکتی محولہ بالا آیت میں پہلے کیوں لایا گیا اور اس کے بعد جینے اور مرنے کا ذکر ہوا اس میں کیا حکمت ہے۔ ذرا غور کرنے اور سوچنے سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے اور عام مشاہدہ بھی ہمیں یہی بتاتا ہے کہ انسان اکثر و بیشتر دوسروں کے لئے جیتا ہے اور اس حیات چند روزہ میں اس کے پیش نظر شہرت' ناموری' جاہ و منصب' وزارت و امارت وغیرہ کا حصول ہوتا ہے۔ یہ الگ بات کہ ایسی زندگی اور ان مادی خواہشات کی تکمیل میں اس پر جو موت وارد ہوتی ہے وہ اللہ کی نظر میں ذلت و رسوائی کی موت ہے۔ تاہم یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ انسان نے الا ماشاء اللہ اپنے نہان خانہ دل میں ہزاروں جھوٹی اور نفسانی خواہشات کے بت سجائے ہوتے ہیں جن کی محبت میں وہ جیتا اور مرتا ہے اور اس کی زندگی بقول اقبالؒ

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نامیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے
کا جیتا جاگتا نمونہ پیش کرتی ہے

ان جھوٹی خواہشوں اور آرزوؤں کے سراب کے پیچھے لوگ دیوانہ وار

بھاگتے نظر آتے ہیں اور خسران فی الدنیا والآخرہ کا مصداق بن جاتے ہیں اس بگاڑ کا امکان انسانی زندگی میں بہت زیادہ ہوتا ہے اور خال خال ایسے ہیں جو اس بازیگاہ ہستی میں اپنا دامن بچا کر گزر جاتے ہیں تو پھر کیا سبب ہے کہ جس کے بگاڑ کا امکان زیادہ تھا اس کا ذکر بعد میں اور جن چیزوں کے بگاڑ کا احتمال تھا ہی نہیں یعنی نماز اور قربانی ان کا ذکر پہلے کیا گیا ایسا کیوں ہوا اس پر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو حاکم مطلق ہے کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں نماز اور قربانی کا ذکر جینے اور مرنے سے پہلے کر کے اس نے ہمیں جینے اور مرنے کا سلیقہ سکھا دیا وہ اس طرح کہ نماز زندہ انسان پڑھتا ہے جبکہ قربانی کا نتیجہ موت ہے تو گویا نماز زندگی اور قربانی موت کی علامت ہے۔

حضور نبی اکرم ﷺ کی وساطت سے اہل ایمان میں ہر ایک سے اس بات کا اقرار کرنے کے لئے کہنا کہ میری نماز اور قربانی اللہ تعالیٰ کے لئے ہے خالی از حکمت نہیں جیسا کہ پہلے صراحت کی جا چکی ہے نماز اور قربانی کا غیر اللہ کے لئے ہونے کا گمان بھی خارج از امکان ہے۔

بلاشبہ یہ دونوں چیزیں خالصتاً اللہ کے لئے ہیں اور جب تک ان کے بارے میں اخلاص پر مبنی طرز عمل نہ ہو یہ بے روح اور ریاکاری سے عبارت ہوتے ہیں تو اس سے ہمیں اخلاق کا سبق ملتا ہے اس اعتبار سے نماز کو حیات اور قربانی کو ممات سے متعلق کر کے اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ بات سمجھا دی ہے کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا جینا اللہ کے لئے ہو جائے۔ تو ہمیں یہ تصور دیا جا رہا ہے کہ اس طرح جئیں جیسے نماز پڑھتے ہیں اور نماز وہی نماز جس میں اللہ کے سوا کسی اور کا دھیان نہ رہے اور غیر اللہ کا خیال دل سے نکل جائے تو جس طرح حالت نماز میں ہمارا رخ کعبے کی جانب ہوتا ہے اسی طرح جب تک ہم جئیں ہمارا دل عمر بھر رب کعبہ سے نہ پھرے اور ایک لحہ بھی اس کی یاد سے غافل نہ گذرے بلکہ یہ خیال کہ

جو دم غافل سو دم کافر

ذہن کے اندر اچھی طرح جاگزیں ہو جائے۔

یہی حال قربانی کا ہے۔ انسان فقط اللہ کی رضا کے لئے قربانی دیتا ہے اور اس کے علاوہ کوئی اور مطمح نظر اس کے سامنے نہیں ہوتا اس سے یہ استنباط ہوتا ہے کہ جس طرح بندہ مومن کی تمام زندگی اللہ کے لئے ہے اور اس کی رضا اس کے ہر عمل کا محرک ہوتی ہے اسی طرح مومن کی موت بھی اللہ کے لئے ہو اور دم واپسیں اس کا انجام اللہ کی رضا اور خوشنودی ہی کے لئے ہو۔ تو اللہ کے لئے جینے اور اللہ کے لئے مرنے کا یہ مفہوم ہے جو ہمیں قرآن سمجھانا چاہتا ہے اس بات کو سمجھ لینے سے یہ بات بخوبی ذہن نشین ہو جاتی ہے کہ جس شخص کا جینا اللہ کے لئے ہو گیا تو اس ضمن میں جو کچھ جینے سے متعلق ہے وہ سب کچھ خود بخود اللہ کے لئے ہو گیا اور جب جینا اس کے لئے ہے تو مرنا بھی اس کے لئے ہو گیا۔ یہ ہے **ایاک نعبد** کا معنی جس کی تعلیم ہمیں قرآن نے دی ہے۔

نکتہ عبادت کی تفسیر عملی زندگی کے حوالے سے

قرآن نے عبادت کی انسان کو جو تعلیم دی وہ ایک ایسا نکتہ ہے جس کو انسان کی روز مرہ زندگی کے حوالے سے ذہن نشین کر سکتے ہیں۔

جب یہ ہم یہ بات کہتے ہیں کہ ہمارا جینا اللہ کے لئے ہے تو اس حیات دنیوی میں کھانا وہ عمل ہے جسے ہم حوائج ضروریہ میں سرفہرست قرار دے سکتے ہیں کہ جینے کے لئے کھانا ازبس ضروری ہے اب جینا اللہ کے لئے ہے تو اس اعتبار سے کھانا بھی اللہ کے لئے ہو گیا۔ گویا نماز اور کھانا برابر ہو گیا یہاں یہ سوال ذہن ابھر سکتا ہے کہ نماز کا عبادت ہونا تو سمجھ میں آتا ہے یہ کھانا جس میں انسان لقمے کھا کر پیٹ بھرتا ہے وہ کیسے شامل عبادت ہو گیا لیکن منطق کی رو سے یہ سمجھنا انتہائی آسان ہے کہ جس طرح جینا اللہ کی عبادت ہے اس طرح کھانا بھی اللہ کی عبادت ہے۔ اب سونا جینے کے لئے ناگزیر ہے اگر انسان نہ سوئے تو اس کے لئے زندہ رہنا اجیرن اور دشوار ہو جائے۔ اس نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو سونا بھی عبادت ہو گیا۔ جب بندہ ہر لحظہ اللہ کی بندگی کو اپنا شعار بنا لیتا ہے تو

اس کا سونا جاگنا برابر ہو جاتا ہے اس کے برعکس وہ لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں اور وہ ہر لحظہ بندگی کو نہیں اپناتے وہ جاگتے ہیں مگر ان کا جاگنا سونے سے بھی بدتر ہوتا ہے۔

اسی طرح جو لوگ حقیقت بندگی کو نہیں پاتے اور وہ نماز پڑھتے ہیں مگر ان کی نماز عبادت نہیں بلکہ ریاکاری کے زمرے میں شمار ہوتی ہے وہ نماز پڑھتے ہیں اور دوزخ کے مستحق بنتے ہیں ان کے مقابلے میں وہ جو اللہ کے بندے ہو جاتے ہیں سو کر بھی محبوب کو مناتے ہیں اس لئے کہ جب سارا جینا اللہ کے لئے ہو گیا تو ان کا اپنا کچھ بھی نہ رہا ان کی ساری زندگی اور زندگی کی تمام حرکات و سکنات تحت الامر ہو گئیں ہر لمحہ امر الٰہی کے تحت ہو گیا۔ ان پر خدا کی بندگی کا رنگ اتنا گہرا چڑھ گیا کہ اب وہ چاہے کچھ کریں کوئی عمل رضائے خداوندی سے باہر نہ ہو گا۔

ایک سبق آموز حکایت

اس ضمن میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے ایک واقعہ کا تذکرہ خالی از فائدہ نہ ہو گا کہ اس سے موضوع زیر بحث کو سمجھنے میں مدد ملے گی اور بنیادی نکتہ واضح ہو جائے گا ایک دفعہ آپ کی ولایت کا شہرہ سن کر ایک عالم طویل مسافت طے کرنے کے بعد بیعت کے ارادے سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جب وہ حضرت کے آستانہ عالیہ میں پہنچا تو وہاں کے شاہانہ انداز، خدام و حشم، جاہ و تمکنت، لباس، کھانا پینا اور رہن سہن کے طور طریقے دیکھ کر دنگ رہ گیا اور دل میں کہنے لگا کہ اللہ کے ولی ایسے ہوتے ہیں یہ امارت یہ ٹھاٹھ باٹھ اور ان سب باتوں کا ولایت سے کیا تعلق۔ اس کی عقیدت کا آبگینہ چور چور ہو گیا اور بیعت کا ارادہ ترک کر بیٹھا۔ واپس لوٹنے کو تھا کہ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے اسے روک لیا اور فرمایا "آپ نے دن تو ہمارے ساتھ گزار دیا ذرا اور توقف کریں اور رات کے احوال بھی دیکھ لیں" وہ آپ کے کہنے پر رک گیا حضرت خواجہؒ نے اپنے خدام سے کہا کہ ان کا بستر میرے کمرے میں لگا دیں۔ بستر لگا دیا گیا جب وہ آپ کی خوابگاہ میں داخل ہوا تو دیکھا کہ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کا

بسترِ کمخواب کا ہے جو شاذ ہی کسی شہنشاہ کو میسر ہو۔ یہ دیکھ کر رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی۔ حضرت خواجہؒ نے عشاء کی نماز پڑھی اور اوراد سے فارغ ہو کر بستر پر دراز ہو گئے اور خواب استراحت کے مزے لینے لگے جبکہ وہ شخص کافی دیر تک مصلے پر نوافل، تسبیح واستغفار اور ذکر اذکار میں مصروف رہا۔ حضرت تہجد کے مقررہ وقت پر اٹھے نوافل ادا کئے اور معمول کی تسبیحات و وظائف پڑھنے کے بعد دوبارہ آرام کرنے کے لئے لیٹ گئے۔ وہ شخص جس نے رات کا بیشتر حصہ عبادت میں گزار دیا تھا اس کے ذہن میں بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ یہ کیسے ولی اللہ ہیں ساری رات لمبی تان کر سوتے رہے اور مجھ جیسا عاصی شب بیداری میں مصروف رہا۔ ساری رات کا تھکا ہارا وہ بستر پر لیٹ گیا اور لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی کیا دیکھتا ہے کہ عالم مثال میں وہ اور خواجہ نظام الدین اولیاء عبادت کر رہے ہیں۔ اس کی عبادت ایک ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی مانند ہے جو کسی لمحے ہوا کے ایک جھونکے سے بجھ جائے یعنی ایسی عبادت جس کے بارے میں کوئی بھروسہ نہیں کہ وہ بارگاہ الٰہی میں مقبول بھی ہے یا نہیں ہے جبکہ حضرت خواجہؒ کی عبادت نور کے ایک ستون کی طرح فرش سے عرش تک اٹھتی نظر آ رہی ہے جس کے نور سے ہزاروں لاکھوں فرشتے لپٹے ہوئے ہیں۔ اپنی اور خواجہؒ کی عبادت کا یہ رنگ جو اللہ نے اسے عالم خواب دکھلا دیا تھا دیکھتے ہی اس کی آنکھ کھل گئی اسنے توبہ کی اور حضرت کے قدموں میں گر گیا۔ عرض کی کہ مجھے تمام شیطانی وسوسوں سے نجات مل گئی ہے لیکن آپ یہ عقدہ حل کر دیں کہ میری اور آپ کی عبادت میں اتنا بڑا فرق چہ معنی دارد؟ میری عبادت کا اتنا کم حجم اور اتنی کم مقدار کہ چراغ سحری کی طرح اس کا کوئی بھروسہ نہیں جبکہ آپ کی عبادت سے زمین سے عرش تک فضا بقعہ نور بنی ہوئی ہے اور فرشتے اس کی نورانیت پر پروانہ وار فدا ہو رہے ہیں۔

اس تفاوت کا کیا سبب ہے۔ حضرت خواجہ عارف باللہ تھے اس لئے آپ کا جواب عالمانہ نہیں بلکہ عارفانہ تھا جس میں کوئی لن ترانی اور چرب زبانی کا انداز نہیں تھا۔ بس سیدھا جواب تھا جواب کیا تھا سمندر کوزے میں بند تھا۔ فرمانے لگے ”آپ نے

چھوٹا بچہ دیکھا ہے جو ماں کو سوتے میں بھی پیارا لگتا ہے" اس مختصر سے جملے میں نکتہ عبدیت اور "ایاک نعبد کا سارا فلسفہ سمٹ آیا تھا۔ ہما شما کی عبادت کا یہ حال ہے کہ رات تسبیح شماری میں گزار دیتے ہیں اور بزعم خویش اپنا تعلق اپنے رب کے ساتھ اس حوالے سے استوار کرتے ہیں کہ ہم نے ایک رات میں اتنے نوافل گزارے اور اتنے لاکھ تسبیحات پڑھ لیں۔ اس طرح ہم لاکھوں کے چکر میں پڑ کر یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ ہمارا تعلق بندگی بڑھ رہا ہے۔ حالانکہ بندگی اور عبادت گزاری کا تعلق اس سے نہیں۔ عارف ربانی نے بچے اور ماں کا ذکر کر کے تمثیلا یہ بات سمجھادی کہ بندہ اس وقت تک بندہ نہیں بنتا جب تک وہ اپنا ارادہ اپنے رب کے ارادے میں گم نہ کردے۔ جس طرح بچے کا بچپن کے زمانے میں اپنا کوئی ارادہ نہیں ہوتا اس کی حرکات و سکنات اور عادات ماں کے ارادے میں ڈھلتی ہیں۔ اس کا سونا جاگنا اٹھنا بیٹھنا ماں کے ارادے سے ہوتا ہے یعنی وہ اپنے ارادے سے فنا اور ماں کے اردے سے باقی ہوتا ہے اسی طرح اللہ کا حقیقی بندہ وہی ہے جو اپنے اردے کو فنا کردے اور اپنے رب کے ارادے سے باقی ہو جائے۔ بندے کی بندگی اس امر کی متقاضی ہے کہ اس کی اپنی تمنائیں۔ آرزوئیں اور خواہشیں رب کی رضا میں گم ہو جائیں اور اس کا کوئی ارادہ اپنا ارداہ نہ رہے۔ اگر بندہ اس مقام بندگی پر فائز ہو جائے تو پھر اس کا سونا بھی اللہ کی نظر میں اتنا محبوب ہو گا جتنا سوتا ہوا بچہ ماں کو پیارا لگتا ہے اور وہ سوتے میں اس کی بلائیں لینے لگتی ہے اسے چومتی ہے اور سو جان سے اس پر واری ہوتی رہتی ہے۔

مقام بندگی کے حوالے سے ہم پر یہ نکتہ آشکار ہو گیا کہ عبادت سبحہ شماری اور شب بیداری کا نام نہیں اور اس کی قبولیت کمیت اور اعداد و شمار پر موقوف نہیں بلکہ یہ اس سے ماوراء ہے۔ بہمہ وجوہ عبادت اپنے مقصد تک تبھی پہنچتی ہے جب ساری چیزوں میں بندے کا اپنا ارادہ ارادہ و مشیت الٰہی میں گم ہو جائے اور اس کا مقصود رب کی رضا میں فنا ہو جانا بن جائے۔ جب بندگی مقام فنا کو پہنچ جاتی ہے تو بندہ بندہ بن جاتا ہے اور اس کا اپنا کچھ نہیں رہتا۔ بندے کا حال تو اس غلام کا سا ہے جس کا اپنا کچھ نہیں ہوتا۔

اس کا نفس، اس کی جان، اس کا سونا جاگنا، کھانا پینا، نشست و برخاست سب کچھ مالک کی مرضی کے تابع ہوتا ہے وہ جو کچھ عمل کرتا ہے اس کے ارادے سے کرتا ہے۔ اپنی ذات کی نفی کر کے ہی وہ مالک سے اپنے تعلق غلامی کو مستحکم کرتا ہے اسی طرح بندہ اپنے ارادے سے فنا ہو جائے تو پھر اس کا سونا جاگنا مولا کی بارگاہ میں یکساں ہو جاتا ہے۔ بلکہ گاہے وہ وقت بھی آ جاتا ہے جب اس کا سونا جاگنے والوں کے جاگنے سے لاکھ درجہ بہتر ہوتا ہے۔ اس مقام پر حضرت سلطان باھوؒ کیا خوب فرما گئے۔

ہک جاگن ہک جاگ نہ جانن ہک جاگدیاں وی ستے ہو

اتے ہکناں نوں رب ستیاں ملیا ہک جاگدے وی گئے مٹھے ہو

یہ فرق کیوں ہے اس بات کو سمجھنا چنداں دشوار نہیں بعض لوگ عبادت کرتے ہیں مگر انہیں عبادت کا سلیقہ نہیں آتا۔ عبادت کی روح سے ان کی آشنائی نہیں ہوتی، ظواہر پرستی اور رسم (RITUAL) نبھانے کو ہی بزعم خویش سب کچھ سمجھ بیٹھتے ہیں اور کچھ ایسے خوش قسمت ہوتے ہی جو ہمہ تن عبادت بن جاتے ہیں۔ ان کا جینا مرنا اور ہر ہر فعل اللہ کی رضا کے لئے ہو جاتا ہے اور یہی درجہ ہے جس کو عبادت کہتے ہیں۔

عبادت کا مفہوم اور عابدین کے درجات

عبادت کے مفہوم کو اس کے صحیح تناظر میں اجاگر کرنے کے لئے صحیح بخاری میں نقل کی گئی ایک حدیث کا حوالہ دیا جاتا ہے جس میں حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص اس نیت سے گھوڑا خریدے اور پالے کہ میں بوقت ضرورت اسے جہاد میں استعمال کروں گا تو پھر اس گھوڑے کی لید کو صاف کرنا اور غلاظت کو پھاوڑے سے اٹھانا بھی اللہ کی عبادت میں شمار ہو گا۔ یہاں ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ گھوڑے کی غلاظت اور لید صاف کرنے کے عمل کو کیوں اللہ کی عبادت قرار دیا جا رہا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ گھوڑے کو جہاد کے لئے خریدا اور پالا گیا ہے اور جہاد اللہ کی راہ میں کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں جو کچھ کیا جائے گا وہ سب اللہ کی عبادت

کے ذیل میں آئے گا۔

یہاں ایک اور نکتہ وضاحت طلب ہے۔ اللہ کے بندے تو سارے ہی ہیں اور ان میں ہر کوئی اس کی عبادت کرتا ہے' ہرلب پر ایاک نعبد کے الفاظ مچلتے ہیں۔ مگر سارے بندے برابر نہیں ہوتے ہرچند ہر ایک اس کا عبد ہونے کا دم بھرتا ہے۔ ہم بنظر غائر دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ جو اللہ کے عبد ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ عبد مربوب

۲۔ عبد محبوب

پہلی قسم عبد مربوب میں وہ بندے آتے ہیں جن کی تربیت و پرورش خود رب کائنات کر رہا ہے۔ ربوبیت اللہ رب العزت کا حق ہے جسے وہ ادا کرتا ہے اس اعتبار سے ہر کوئی عبد مربوب ہے کہ ایسا کوئی فرد بشر نہیں جو اس کی ربوبیت کا محتاج نہ ہو۔

دوسری قسم عبد محبوب کے ذیل میں وہ بندے آتے ہیں جو اللہ ہی کے ہو جاتے ہیں۔ ہر ایک عبد ہے مگر عبد محبوب کوئی کوئی ہوتا ہے۔ جب کوئی بندہ اللہ کا محبوب ہو جائے تو اس کے ساتھ برتاؤ اور طرح کا ہوتا ہے۔ محبوبیت کے ساتھ بندہ پروری کی روش تبدیل ہو جاتی ہے یہ امر مسلمہ ہے کہ عاموں کے ساتھ سلوک اور برتاؤ خاصوں کے مقابلے میں مختلف نوعیت کا ہوتا ہے۔ یہ معاذاللہ کوئی ایسی بات نہیں جو نظام عدل وانصاف کے منافی ہے۔ اللہ کی نسبت ظلم و ناانصافی کا گمان بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ایسا تصور کرنا بھی نادانی اور حماقت ہے۔ فقط بات اتنی ہے کہ اللہ کا بندوں سے مختلف برتاؤ جزا و سزا کے حوالے سے ہوتا ہے۔ نیکوں سے برتاؤ جزا کا اور بدوں سے سزا کا ہے۔ تو جس طرح نیک وبد کے ساتھ برتاؤ میں فرق ہے اسی طرح نیکوں کے بھی کئی درجے ہیں اور ان کے ساتھ برتاؤ میں بھی درجہ بہ درجہ فرق و امتیاز روا رکھا جاتا ہے۔ نیکوں میں بعض اجر والے ہیں او بعض اجر والے نہیں بلکے قرب والے ہیں۔ اجر والوں کو ان کے ہر عمل کی اجرت دی جاتی ہے مگر جو قرب والے ہیں۔ وہ اجرت

نہیں مانگتے ہیں نہ لیتے ہیں بلکہ وہ صرف انعام لیتے ہیں جو انہیں بے طلب دیا جاتا ہے۔

ان دو قسم کی درجہ بندیوں (CATEGORIES) کا فرق قرآن حکیم سے واضح ہو جاتا ہے۔ فرعون مصر کے واقعہ کے ذیل میں مذکور ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیروکار فرعون کے دست تظلم سے نجات حاصل کرنے کے لئے جمع ہو گئے اور ان کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ فرعون کی حکومت و سلطنت اور اقتدار خطرے میں پڑ گیا اور اس نے دیکھا کہ بنی اسرائیل میرے قبضہ و اقتدار سے باہر نکلنے کے لئے حضرت موسیٰ علیہا السلام کی قیادت میں زور پکڑ رہے ہیں۔ اس نے موسوی غلبہ اور اثر کو ختم کرنے کی ایک تدبیر سوچی اور اپنی سلطنت کے سارے جادوگروں کو بلایا اور کہا کہ تم سب مل کر اپنے جادو کے زور سے موسیٰ علیہ السلام کے جادو کو ختم کر دو اور پوچھا کہ تمہارا سب سے بڑا جادو کیا ہے۔ وہ کہنے لگے کہ ہم اپنی رسیاں زمین پر پھینکیں تو وہ جادو کے اثر سے سانپ بن جائیں۔ فرعون نے کہا یہ تو بڑی بات ہے۔ چنانچہ اس نے سارے جادوگر جمع کر لئے اور کہا کہ تم مجمع عام میں لوگوں کے سامنے اپنے جادو کا مظاہرہ کرو تاکہ بنی اسرائیل کے سر موسیٰ علیہ السلام کا جو جادو چڑھا ہوا ہے اور وہ انکے دلوں پر حکمرانی کر رہے ہیں اس کا توڑ کیا جائے اس مقام پر قرآن بیان کرتا ہے کہ جادوگروں نے فرعون سے سوال کیا کہ ہم تیرے کہنے پر جادو کا عمل کرنے کے لئے آگئے ہیں لیکن تو یہ بتا کہ اگر ہم موسیٰ علیہ السلام کی طاقت پر غالب آگئے تو ہمارا اجر کیا ہو گا ہمیں اس کے صلے میں کیا ملے گا۔ اس کا جواب جو فرعون نے دیا وہ قرآن کے الفاظ میں انتہائی معنی خیز ہے۔ فرعون نے بجائے یہ کہنے کے کہ وہ انہیں بڑی سے بڑی اجرت دے گا اور اپنے خزانے کے منہ ان پر کھول دے گا یہ کہا۔

قال نعم و انکم لمن المقربین (فرعون نے) کہا ہاں البتہ تم میرے مقرب ہو جاؤ گے۔
(الاعراف: ۱۱۴)

فرعون نے ساحران مصر کو اس امر کی یقین دہانی کرائی کہ کامیابی کسی صورت میں وہ انہیں اپنے ان درباریوں میں شامل کرے گا جو اس کے مقرب ہیں۔ گویا یہ بات

فرعون بھی سمجھتا تھا کہ اجرت کی تو ہزاروں صورتیں ہو سکتی ہیں مگر وہ نقطہ جہاں جا کر اجرت کا تصور ختم ہو جاتا ہے اس کا نام قرب ہے جو روپیہ پیسہ 'منصب' جائداد اور اسی قبیل کی ہر شے سے بالا تر ہے۔ فرعون کو علم تھا کہ اس کا مقرب خاص ہونا وہ چیز ہے جو انسان کو سب چیزوں سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ یہ فرعون کی سوچ تھی وہ اگر کسی کو بارگاہ کا قرب عطا کرے تو وہ دنیا کی سب اجرتوں سے بلند تر ہو جاتا ہے۔ طلب اجرت اور وعدہ قرب دو الگ اور مختلف چیزیں ہیں۔ اللہ کا بندہ جب بندگی کے لئے سرنیاز خم کرتا ہے۔ اس کی تسبیحات' عبادات و استغفار اس لئے ہوتا ہے کہ اللہ مجھے اس کے عوض دس نیکیاں عطا کرے گا میرے دس گناہ معاف کردے گا اور میرے دس درجے بلند ہو جائیں گے تو یہ اجر ہے جو اجرت کے طلبگاروں کے لئے رکھا گیا ہے۔ یہ اپنی جگہ حق ہے مگر اس کی آرزو و تمنا ان کو ہوتی ہے جو اجرت کی طلب رکھتے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔

من جاء بالحسنۃ فلہ عشر امثالھا	جو ایک نیکی کے ساتھ حاضر ہو اس جیسی
(الانعام' ۶:۱۶۰)	دس اس کے لئے ہیں۔

یہ حسنات (نیکیاں) ہیں جن میں کسی کا اجر دس گنا' کسی کا ستر گنا' کسی کا سو گنا اور کسی کا سات سو گنا مقرر کیا گیا ہے۔

یہ اللہ کی طرف سے سودا ہے جس کی صلائے عام بندوں کو دی جاتی ہے۔ کہ وہ عمل پہ عمل کرتے چلے جائیں انہیں جو اجر کے طالب ہیں اجر دینے والا میں ہوں اس لئے کہ

و ھو یجیر ولا یجار	اور وہی (سب کو) اجر دینے والا ہے اور
(المومنون' ۲۳:۸۸)	کوئی اسے اجر دینے والا نہیں۔

اس کا فرمان ہے کہ میرا تو کام ہی اجر دینا ہے۔ ہر کسی کو اس کی طلب کے مطابق اجر ملتا ہے اور اس کا انحصار عمل کیے جانے پر ہے۔ لیکن یاد رہے کہ سارے بندے اجرت طلب کرنے والے نہیں ہوتے۔ کچھ بندے ایسے بھی ہیں جو اس آیتہ

دینہ کے مصداق ہیں۔

والذین یبیتون لربھم سجدا و قیاما (الفرقان، ۲۵: ۶۴) وہ جو رات اللہ کی یاد میں سجدے اور قیام کرتے گذار دیتے ہیں۔

ان میں وہ بھی ہیں جن کی شان یہ ہے۔

الذین یذکرون اللہ قیاما و قعودا و علی جنوبھم (النور، ۲۴: ۳۷) وہ جو اللہ کا ذکر کرتے ہیں کھڑے ہوئے، بیٹھے اور پہلوؤں کے بل لیٹنے کی حالت میں۔

اور وہ بھی ہیں جو ہمہ وقت یاد الٰہی میں مستغرق رہتے ہیں جن کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔

رجال لا تلھیھم تجارۃ و لا بیع عن ذکر اللہ (الکھف، ۱۸: ۲۸) وہ بندگان خاص جنہیں تجارت اور خرید و فروخت (کسی لمحے) اللہ کے ذکر سے روکے نہیں رکھتی۔

یہ بندگان مولا مست جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ ساری راتیں سجود و قیام میں گزارتے ہیں، وہ کھڑے بیٹھے، کروٹ کروٹ لیٹے ہوئے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ ان کے ذکر و فکر اور یاد الٰہی میں ان کا کاروبار بھی مانع نہیں ہوتا۔ وہ صبح و شام اسی کو پکارتے ہیں لیکن وہ کبھی نہیں پوچھتے۔ اے مولا! ہم ساری رات تیری یاد میں جاگتے رہے قیام و تلاوت قرآن کرتے رہے۔ عمر بھر روزے رکھے اور ہر لمحہ تیری یاد میں بسر کیا بتا تو ہمیں اس کا کیا اجر عطا کرے گا۔ وہ تو یہ کہتے ہیں مولا ہمیں کسی اجر کی تمنا نہیں ہم تو بس تیری رضا چاہتے ہیں۔ تجھ سے فقط تجھی کو مانگتے ہیں۔ حسن لازوال کی ایک جھلک قرب کا ایک لمحہ اس کے سوا کوئی اور سوال نہیں کرتے۔ وہ صبح و شام اپنی مناجاتوں اور دعاہائے نیم شبی میں سوائے اس کے جلوہ حسن کے کچھ طلب نہیں کرتے۔

الذین یدعون ربھم بالغداوہ وہ لوگ جو صبح و شام اللہ کو پکارتے ہیں

والعشی یریدون وجہہ   صرف اس کے جلوے (رضا) کے طلب گار ہیں۔   (الکھف'۱۸: ۲۸)

ان لوگوں کی صبحیں اور شامیں اپنے مولا کو پکارنے میں بسر ہوتی ہیں۔ جب بارگاہ حق سے پوچھا جاتا ہے کہ اے میرے بندو! اس کے عوض تم کیا صلہ چاہتے ہو کیا اجر مانگتے ہو' اپنے نامہ اعمال میں کتنے ثواب لکھانا چاہتے ہو' کتنے درجے بڑھانا چاہتے ہو' کتنے گناہ بخشوانا چاہتے ہو' مگر ہر سوال کے جواب میں وہ فقط یہ کہتے ہیں باری تعالیٰ ہمیں کچھ نہیں چاہئے بس ایک بار اپنے جلوہ حسن کو بے نقاب کر دے اور اپنے مکھڑے کی ایک جھلک دکھا دے۔ حسن لازوال کی ایک جھلک جس کی مدہوشی' مستی اور بے خودی قیامت تک نہ جائے۔ وہ اللہ سے اپنی عبادت گزاریوں کے عوض سوائے وجہ اللہ کے اور کچھ نہیں مانگتے' کوئی سودا نہیں کرتے۔ وہ تو اس بات کے قائل ہیں۔

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

ایک بصیرت افروز حکایت

مشہور عارف باللہ حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ سے منسوب "اسرار الاولیاء" میں ایک واقعہ درج ہے۔ کہ بنی اسرائیل کے زمانے میں ایک بڑا عابد و زاہد تھا۔ جس نے ستر سال تک اللہ تعالیٰ کی عبادت' مجاہدہ اور ریاضت میں ستر سال عبادت کرتے ہوئے گزار دیئے تو اللہ تعالیٰ نے اس زمانے کے نبی کو وحی کی اور فرمایا میرے فلاں بندے کے پاس جا اور اسے یہ میرا پیغام پہنچا دے کہ اے بندے! تو نے ستر سال تک میری عبادت کی لیکن یاد رکھ کہ میں نے تیری عبادت قبول نہیں کی۔ یہ سن کر وہ خوشی سے جھومنے لگا۔ اس پر وہ نبی زماں کہنے لگا! اے ناداں تجھے تو رونا چاہئے کہ تیری ستر سالہ عبادت بارگاہ خداوندی میں قبول نہیں ہوئی۔ بجائے توبہ و استغفار اور اظہار

ندامت کے تو خوش ہو رہا ہے اس کا کیا سبب ہے؟ وہ کہنے لگا حضرت! آپ درست فرماتے ہیں لیکن ماجرا یہ ہے کہ میرا کام محنت' ریاضت اور بندگی کرنا تھا۔ باقی رہا اسے قبول کرنے یا نہ قبول کرنے کا تعلق اس سے مجھے کوئی غرض نہیں۔ میرے خوش ہونے کی وجہ یہ ہے کہ میں نے جو کچھ کیا اس کے شمار میں تو آگیا۔ اس کا یہ کہلوانا کہ اسے میری ستر سالہ عبادت قبول نہیں میرے لئے بہت بڑی بات ہے۔ اسی بہانے میں اپنے مولا کی نظروں میں تو ہوں۔ بس میں جو چاہتا تھا وہ مجھے مل گیا۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے بات سمجھانے کے لئے مثالیں دی ہیں۔ وہ مچھر کی مثال دینے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا۔ یہ اللہ کی سنت ہے اسی کے اتباع میں اولیاء کرام اور عرفائے عظام نے تمثیلات کے ذریعے بڑے بڑے عقدے حل کر دیئے ہیں۔

اخلاص عمل پر مزید مثالیں

اخلاص عمل کے بارے میں ایک مثال لیلیٰ و مجنوں کی دی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ لیلیٰ نے اپنی صحت یابی کی خوشی میں خیرات بانٹی۔ کھانا پکایا اور فقرا و مساکین کو آواز دے کر بلایا کہ میری بحالئی صحت پر شکرانے کا کھانا لے جاؤ۔ ہر کوئی اپنا کاسہ لئے قطار میں کھڑا ہو گیا۔ مجنوں بھی کاسہ بدست کھڑا تھا۔ جب اس کی باری آئی اور اس نے اپنا کاسہ آگے بڑھایا۔ لیلیٰ نے بجائے خیرات دینے کے اس کے کاسے پر الٹا ہاتھ مارا اور اسے نیچے گرا دیا۔ پیالہ گر کر ٹوٹ گیا مجنوں نے بجائے پریشاں اور کبیدہ خاطر ہونے کے ٹکڑے اٹھائے اور اظہار خوشی کے طور پر ناچنے لگا۔ لوگوں نے اسے وجد میں ناچتے دیکھا تو پوچھا کہ مجنوں تیرا پیالہ بھی ٹوٹ گیا اور خیرات بھی نہ ملی۔ پھر بھی نادم ہونے کی بجائے خوشی سے رقص کناں ہو اس کا کیا سبب ہے؟ مجنوں کہنے لگا! تم نے اس تعلق کو سمجھا ہی نہیں جو لیلیٰ کا میرے ساتھ ہے۔ اتنے گداگر آئے پر ایک سے یکساں سلوک ہوا اور ہر کوئی خیرات لے کر گیا یہ میں ہی تھا جسے اس سلوک کا مستحق سمجھا گیا۔ پیالہ ٹوٹا

تو میرا ہوتا ہی اور کیا نہیں۔ میں ناچ رہا ہوں کہ اسی بہانے میں اپنے محبوب کی نگاہ میں تو آگیا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں کہ کسی شمار و قطار میں تو ہوں میرا مقام اوروں سے مختلف ہے۔

اس قرب والے تعلق پر مزید سند تصدیق ایک اور مثال سے بھی مل جاتی ہے۔ جس کا تذکرہ قرآن مجید، کتب تفسیر اور کتب احادیث میں بھی ہے اس کا تعلق اللہ کے ایک برگزیدہ پیغمبر حضرت ایوب علیہ السلام سے ہے۔ اس سے یہ سمجھانا مقصود ہے کہ جب اللہ کے ساتھ بندگی کا کامل تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ تو من و تو کے سارے امتیازات مٹ جاتے ہیں اور لوح دل و دماغ پر اسی کی یاد کا نقش ثبت ہو جاتا ہے۔

روایات میں ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے آزمائش کے طور پر ایک بیماری میں مبتلا کر دیا۔ جسم اقدس میں کیڑے پڑ گئے کوئی حصہ کیڑوں سے محفوظ نہ رہا۔ حالت یہ ہو گئی کہ سارے جسم کو کیڑوں نے اس طرح چاٹ لیا جس طرح دیمک لکڑی کو چاٹ لیتی ہے۔ اس سے حضرت ایوب علیہ السلام کی کرب و تکلیف کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن اس جان لیوا تکلیف سے دوچار ہونے کے باوجود انہوں نے شکوہ کا ایک حرف بھی منہ سے نہ نکالا بلکہ الٹا انہیں کیڑوں سے محبت ہو گئی اور جب زخموں سے کوئی کیڑا نیچے گرتا تو وہ اسے اٹھا کر پھر اسی جگہ رکھ دیتے۔ کیڑوں کو عزیز جان سمجھ کر سنبھال کر رکھتے۔ یہ ابتلا کا دور تھا جو آخر کار ختم ہو گیا اور وہ اس آزمائش سے سرخرو نکلے۔ جب وہ صحت یاب ہو گئے تو لوگ مبارک باد دینے آئے کہ اللہ نے آپ پر کرم کیا اور آپ کی تکلیف رفع ہو گئی۔ حضرت ایوب علیہ السلام لوگوں کی مزاج پرسی پر فرمایا کرتے تھے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ صحت بہت بڑی نعمت ہے اور اس پر اللہ کا شکر دل و جان سے کرنا چاہئے مگر جو مزہ اس بیماری میں تھا وہ اس صحت میں نہیں اس کے سبب کے بارے میں استفسار کرنے پر آپ نے فرمایا کہ بیماری کے عالم میں ہر روز صبح و شام محبوب حقیقی کی مٹھاس بھری آواز میرے کانوں میں پڑتی تھی اور میرا رب میری عیادت کرتا تھا جب یہ دل نواز صدا آتی ایوب تیرا مزاج کیسا ہے تو بخدا

سارا دن عالم وجد و مستی میں گزر جاتا اور دل چاہتا کہ یہ ابتلا کا عالم جاری رہے تاکہ شام پھر صدائے محبوب سماعت نواز ہو آج جب صحت ہو گئی تو وہ شبانہ روز عیادت کی لذت باقی نہ رہی۔

عیادت کو آئے شفا ہو گئی
علالت ہماری دوا ہو گئی

محبوب کے ہاتھوں تکلیف و آزار میں جو راحت و لذت ہے اس کا حال الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ایک عجیب کیف و سرشاری کی کیفیت دل و جان کو احاطہ کئے رہتی ہے کسی صوفی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

کاش دشمن کے نصیب میں یہ بات نہ ہو کہ وہ تیری تلوار کی ضرب سے ہلاک ہو جائے۔ تیرے خنجر آزمانے کے لئے تیرے دوستوں کا سر جو سلامت ہے وہ تیرے احسان کے زیادہ حقدار ہیں۔

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے

وہ لوگ جو اللہ کی طاعت و بندگی میں مقام تسلیم و رضا کو پا لیتے ہیں ان کی گردن پر رضائے الٰہی کا خنجر چلتا رہتا ہے لیکن وہ کشتگان حق ہر لمحہ غیب سے نئی زندگی پاتے ہیں ان کے دل ہمہ وقت اس آرزو کا گہوارہ بنے رہتے ہیں کہ محبوب کا خنجر ان کے حلقوم پر چلتا رہے اور وہ ہر لحظہ اس کی محبت میں حیات نو سے بہرہ ور ہوتے رہیں۔

کشتگان خنجر تسلیم را
ہر زماں از غیب جان دیگر است

ایمان کوئی معمولی متاع نہیں جسے جب چاہے کسی دکان سے حاصل کر لیا جائے اس دولت کو حاصل کرنے کے لئے جاں کی بازی لگانا اور سر کٹانا پڑتا ہے۔ اسی لئے

اقبالؒ کو بے ساختہ کہنا پڑا۔

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا

مسلمانی عبادت اور معاملات میں اخلاص کا تقاضا کرتی ہے۔ ہمارے اسلاف اس اخلاص کی دولت سے مالا مال تھے۔ ہمیں اپنے بزرگوں سے اخلاص کا سبق حاصل کرنا چاہئے۔ کسی نے اس بارے میں کیا خوب کہا ہے۔

اخلاص عمل مانگ نیا گان کہن سے
شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را

ہمارے لئے **ایاک نعبد** کہنا بڑا آسان ہے مگر اپنی پوری زندگی کو بندگی وطاعت الٰہی میں خود سپردگی کے جذبے سے سرشار ہو کر بسر کر دینا دشوار کام ہے۔ بندہ جب کامل طور پر اس کی بندگی میں آجاتا ہے تو اس کے دل سے سب آرزوئیں اور خواہشیں ختم ہو جاتی ہیں۔ پھر دنیا و عقبیٰ ' حور و قصور اور سب قسم کی آرزوئیں مٹ جاتی ہیں اور فقط ایک ہی تڑپ باقی رہتی ہے جو قرب مولا کی تڑپ ہے۔ جس کے نتیجے میں بندہ فقط بندہ رب بن جاتا ہے۔

بندہ کس طرح اپنے محبوب کا بن کر رہ جاتا ہے۔ اس پر یہ روایت شاہد عادل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایاز کے بارے میں بعض درباریوں نے محمود غزنوی سے شکایت کی کہ وہ اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتا ہے اور ہمیں خاطر میں نہیں لاتا۔ اس پر خصوصی شفقت کیوں اور ہمیں کیوں نظرانداز کیا جاتا ہے۔ محمود غزنوی نے درباریوں کی بات سن کر کہا کہ اس جواب آج نہیں پھر کبھی دوں گا جس سے یہ واضح ہو جائے گا کہ تم میں اور ایاز میں کیا فرق ہے۔ ایک روز محمود غزنوں نے سب درباریوں کو طلب کیا اور ان کے سامنے قیمتی ہیرے اور جواہرات بکھیر کر کہا کہ ان کو چن لو اور جو جس کے ہاتھ لگ گیا وہ اس کا ہے۔ سارے درباری ہیروں کی طرف لپکے ہر ایک اس کوشش میں تھا کہ زیادہ قیمتی ہیرے پر ہاتھ ڈالے۔ سارے درباری ہیروں اور جواہرات کی طرف

دوڑے صرف ایاز اپنی جگہ کھڑا رہا۔ آخر میں وہ آگے آیا اور بڑھ کر محمود کے قدم تھام لئے اور عرض پیرا ہوا مجھے ہیروں جواہرات کی کوئی طلب نہیں میرا سب کچھ تو ان قدموں میں ہے۔ درباریوں نے یہ دیکھا تو انہیں اپنے سوال کا جواب خود بخود مل گیا۔

حرف آخر

اس ساری بحث کا لب لباب یہ ہے کہ بندگی کا منتہائے مقصود قرب الہی ہے۔ جو اگر نصیب ہو جائے تو بندہ صحیح معنوں میں بندہ بن جاتا ہے اور وہ نہ صرف سب دنیاوی طلبوں اور آرزوؤں سے بے نیاز ہو جاتا ہے بلکہ رضائے مولا کے سوا کوئی طلب اس کے دامن گیر نہیں رہتی۔ حتی کہ قطب، غوث، نجیب اور نقیب بننے کی طلب بھی اس کی نگاہ میں کسی نہ کسی اجرتوں کا درجہ رکھتی ہے اور وہ اس سے بلند اور ماورا ہو جاتا ہے۔ پھر جب وہ ایاک نعبد کہتا ہے تو ایسا کہنے کا اس کو حق ہے۔

پھر جب بندہ حق اللہ کا مقرب بن جاتا ہے تو اسے عبد ماذون بنا دیا جاتا ہے وہ اجرت اور اجر والے مقام سے اوپر اٹھ جاتا ہے اور صرف رضائے مولا اس کا مطلوب بن جاتی ہے۔ عبد ماذون وہ ہے جسے اللہ کا اذن مل جاتا ہے۔ پھر ایک منادی ندا دیتا ہے کہ میرے بندو! تم نے میری بندگی اجرت اور اجر و ثواب کے لئے کی اور وہ تمہیں حاصل ہو گیا لیکن میرے عباد ماذون کی طرف دیکھو انہوں نے میری رضا کے لئے دنیا ومافیہا سے منہ موڑ لیا اور وہ اجر و ثواب اور اجرتوں سے بے نیاز ہو کر میری عبادت کرتے رہے۔ میں نے انہیں اپنی مقرب اور عبد ماذون بنا لیا ہے۔ انہیں مربوبیت کے درجے سے اٹھا کر محبوبیت کے درجے پر سرفراز فرما دیا گیا ہے۔ اب انہوں نے اتنی بڑی نعمت پالی ہے کہ اب جو ارادہ بھی یہ دل میں کریں وہ میری تقدیر بن جائے گا۔ ان کی نگاہوں سے تقدیریں بدل جائیں گی۔ ان کا بولنا میرا بولنا ان کا دیکھنا میرا دیکھنا اور ان کا پکڑنا میرا پکڑنا تصور کیا جائے گا ان سے محبت مجھ سے محبت اور ان سے دشمنی مجھ سے دشمنی سمجھی جائے گی۔

ایک حدیث قدسی میں ہے لا یزال یتقرب الی بالنوافل حتی احببتہ
(بخاری، منہاج الصالحین: ۹۱۸)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وہ بندہ جو میرا بندہ ہوتا ہے نوافل سے میرا قرب پاتا جاتا ہے حتی کہ میں اسے اپنی بارگاہ قرب میں لے لیتا ہوں اور اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ اس مقام پر وہ بندہ میرا بندہ محبوب، بندہ ماذون بن جاتا ہے۔ وہ پھر "منتظر" نہیں بلکہ "منتظر" بن جاتا ہے۔ مرید نہیں بلکہ مراد، طالب نہیں بلکہ میرا مطلوب ہو جاتا ہے۔ اب اس پر طعنہ زنی کرنا مجھ پر طعنہ زنی کرنا ہے۔

ایاک نعبد کے یہ الفاظ اگر ہمارے رگ و ریشے میں اتر جائیں تو عملی زندگی روبہ اصلاح ہو جاتی ہے اور بندگی عملاً اللہ کی بندگی بن جاتی ہے اور خدا کی ساری خدائی اسی کی ہو جاتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے بندگی کے اس قابل رشک مقام کے حوالے سے کیا خوب کہا۔

یہ بندگی . خدائی، وہ بندگی گدائی
یا بندہ خدا بن یا بندہ زمانہ

آیئے! ہم ایاک نعبد کے اس فلسفے کو اپنے رگ و پے میں اتارنے کی سعی کریں اور وہ مقام بندگی پالیں جو سورہ فاتحہ کا تصور عبادت اپنی تمام تر بلاغت طرازیوں اور حکمت آفرینیوں کے ساتھ ہمیں عطا کر رہا ہے۔